

باق

دیکھئے آج کسی بنتی ہے بعد مدت کے سامنا ہو گا۔

خورشید مرزا کے دل پر جو کچھ گذر رہی تھی اُس کو ہم نہ کسی زبان سے بیان کر سکتے نہ قلم سے لکھ سکتے ہیں، دل بار بار کہتا تھا پھیس برس کے بعد کچن نے ملا جیا ہے۔ وہ پہلے پہل دل کا آنا دہ اُسوقت اور اُس سن کی دلی اُمنگیں، وہ اُپس کے کھیل کوڈ، وہ بات بات پر کچن کا بگڑ جانا اور چھر من جانا، وہ پیاری پیاری صورت، وہ سِن دسال، وہ نظریں بجا کے ایک دوسرے کو دیکھنا، وہ اُمیدیں، وہ کامیابی کی پوری اُمید، وہ دفعتہ ناکامی اور رقیب کا رفعتہ پیدا ہو جانا۔ وہ دشمن کا کامیاب ہو جانا وہ اپنی بے لبسی وہ دلہن جو اپنی ہوئے والی تھی دوسرے کی ہو جانا اُس کا خوشی خوشی لے کے چل دینا اور اپنا دیکھتے رہ جانا، یہ ایسے چر کے شکھے جو خون کے آنسو نہ رُلواتے۔ کیسے شعلے دل سے نکلے ہوں گے۔ مگر اب اُس کو پھیس سال ہو گئے تھے۔ سارے چھے نوبجے قبل نصف النہار یہ رفعہ ملا تھا۔ اب سارے تین بچے بعد نصف النہار پورے چھہ گھنٹہ دیوان خانہ کی کلاں میں تین کے بعد آدھا بجا ہے۔ پورے چھہ گھنٹہ خورشید مرزا کے دماغ کے دفتر اُٹ پلٹ ہو رہے تھے، غشن اُمید صال اپنی ناکامی، رقیب کی کامیابی آہ! ناکامی اور کسی ناکامی، کامیابی اور کسی کامیاب زندگی بھر کے لئے یاس کا سامنا، پر خیالات اُب سے پھیس برس اُدھر کے تھے۔ اُسوقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گو یا ابھی کا واقعہ ہے۔ ابھی کل کا ذکر ہے علی جان بخاری بچے

کا جوڑا ہیں کے کیسا اتر اتا پھر تما تھا۔ اس سے بڑھ کے کیا بدفصیبی ہو گی، ہم نے خود انہوں سے دیکھا، اب کیا کہیں کن آنہوں سے دیکھا۔ لہو کے سے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ وہ برات کا دن کبھی نہ بھولے گا کم جنت دیمرے جلانے کو، میرے گھر کے قریب سے برات لے کے گیا۔ دنہیں نہیں، علی جان مجہہ کو کیا جانے یہ خبط ہے، محفوظ اتفاق سوارِ لفاظ پھراوہر ہی برات گئی۔ جہیز میں کیا کچھ نہ تھا۔ دیگیں منکے اور تابنے کے برتن چینی کے برتن صندوق، پیارے گلکا جھنی پنگ دار اپیش گیر سبز گھوڑا، کیسا سی سجا یا۔ اسی گھوڑے پر سوار ہو کے علی جان شہر میں بکلا کر تما تھا۔ یہ کیا خیالات ہیں دیوانگی، گذری باتیں خواب کی باتیں، علی جان کو مرے ہوئے مدت ہو گئی۔ کھجور نے اپنی بیماری کا حال لکھا ہے کچھ مفصل نہیں لکھا، کہیں دہ خاندانی مرض نہ ہوئے ہے خدا نہ کرے؛ خدا جانے اب کسی صورت ہو گی۔ اپنی صورت تو ایسی بدلتی کہ جوانی کی تصویر سے اب زمین آسمان کافروں ہے۔ غم نے گھلاد دیا۔ غم اور کیسا غم، خدا و شمن کو یہ غم نہ دئے، کیا نامزاد ندی بسر کی۔

خورشید مرزا اسی طرح اپنے خیالات میں غرق ہی کہ راستہ میں یہ بھی یاد نہیں کب گھر سے نکلنا چاہئے۔ اے لو، حسین علی پیچھے چلا آتا ہے۔ وہاں لے جانا مناسب نہیں۔ حسین علی گھر کا خفیہ پولیس ہے۔ میرا ابادہ تو عقد نامی کا نہیں ہے مگر وہ کیوں کو گھر کی ماما اصلوں لے کر عجیب طرح کی بدگمانی پیدا ہو گئی ہے ایک ایک بات باہر کے نوکر دل سے پیچھہ اتی جاتی ہے۔ یہ کسبخت بھی روٹیوں کے لائچ سے ہے ہوئے میں ہر بات کی گھر میں خبر نہیں چاہتے ہیں۔ کہی نوکر چھڑا دئے مگر جو آتا ہے ایسا ہی ہو جاتا ہے کوئی بس نہیں۔ آج بیچ کو ہر ہی کا آنا غصہ موا۔ اور پھر میرا جانا اُسی دن خدا جانے کیا خیال ہو گا۔ پیچھے مڑ کے دیکھا حسین علی کو رخصت کر دیا۔

خورشید مرزا۔ حسین علی۔

حسین علی - حضور -

خورشید مرزا - درزی سے کپڑوں کا تھا صندھ کرو نوروز قریب آگیا درزی نے ابھی تک گرمی کے کپڑے ہنیں تیار کئے، میرے ساتھ جانا کچھ ضرور نہیں میں تھوڑی دیر میں رات سے پہلے آجائوں گا۔

حسین علی - سمجھہ تو گیا مگر مجال کیا تھی جو کچھ عذر کرتا، بہت خوب کہہ کے رخصت ہو گیا۔ اور درزی سے دو جوڑے تیار تھے لے کے گھر پہنچا۔ کپڑے گھر میں ٹھیک اور راستہ سے رخصتی کی۔ خبر بھی اب تو گھر پہنچ کر یقین ہو گیا، تھیں اسی جگہ ٹھکرے ہیں جس کی رازداری حد سے زیادہ ہے کسی دوست کے گھر پر پہنچنے تو نہ کہ کو راستہ سے کیوں پھر دیتے۔

جعفری - "دیکھئے خدا کیا دکھاتا ہے، خدا غارت کر لے جو باو اچان کو ہماری برپادی کی صلاح دے۔"

نادری - "کے مزاج میں شو خی تھی بڑی بہن کو بکھر جھکتے دیکھ کے، تو کیا مونا دوسری آماں جان آ جائیں گی؟"

جعفری - "بہت خفا ہو کے، تیرے منہ میں خاک، خدا مجھے اُسدن کو موت دے، سمجھے تو گیا کوسوں۔"

نادری - با جی تو پھر کیا کرو گی، آبا جان کی خوشی۔ بھئی یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ دل کو صد مہ نہ ہو گا مگر کیا مجال زبان سے کچھ کہوں یا چھڑ پر پل لئے۔

جعفری - ہاں تم تو یہ چاہتی ہی تھیں۔ میں تو اس گھر میں نہ رہوں گی۔ کچھ کھائے سو رہوں گی۔

نادری - ہا! با جی حرام موت! جو خداد کھائے ہم کوئی باو اچان پر حاکم نہیں۔ یہ آپ کی تکرارہ لون کروں تک بھی پہنچ گئی تھی، اسی وقت سے دو فریڈ مونی۔

ایک نادرتی کے ساتھ ہو گیا وہ سراج عفری کا ہم خیال تھا۔

خورشید مرزا انھیں خیالات میں غرق ہیں چلے جائے ہیں، راستہ میں اکثر اجھا بے ملاقات ہوئی۔ صاحب سلامت ہوئی مزاج پر سی ہوئی مگر یہ سب ناخواستہ دیساختہ الگ کسی لے اپنی روئیں خیال نہ کیا ہو تو اور بات ہے مگر جس نے عنور سے دیکھا ہو کا صاف سمجھہ گیا ہو گا کہ یہ خورشید مرزا وہ ہنس ہیں ہیں جن سے اور بھی اُتر ملاقات ہو اکی ہے۔ مگر کسی کو کیا غرض جو کچھہ حال پوچھئے اور پوچھئے بھی تو کہتا کون۔

شده شدہ نے لگاؤں میں پہنچ گئے۔ فینتو کی جو می خور ڈرمی سی تلاش کے بعد مل گئی۔ گھر میں خبر ہوئی۔ اندر بلائے گئے۔ بلاںے والی کابھی کلیجہ اور چھل رہا ہے۔ اور جو بلا یا کیا ہے اُس کا دل بھی دھڑک رہا ہے۔ اب سامنا ہوتا ہے، خورشید مرزا ایک محضر گر صان سنتھرے مکان کی انگنانی میں سے ہو کے گزرے، وہی ہر سی جو صحیح کو رفع لے کے کی تھی آگے آگے اب ایک زینہ پر سے کوئی سولہ سنتھرہ سٹرھیوں پہ گزر کے کوٹھے پر ایک ہوادار کمرے میں پہنچے۔ بیاں سامنا ہوا۔ خورشید بیگم ایک نوار ڈی پنگ پر لیٹی تھیں اُ قدماں کی آہٹ کے ساتھ ہی آٹھ بیٹھیں، خورشید مرزا سامنے کھڑے ہیں، آمنا سامنا ہوا چار آنکھیں ہوئیں۔ دونوں کا یہ حال ہوا جیسے مر جھائے ہوئے پھولوں میں کچھہ مٹا ہوا رنگ کچھہ ستمہ خوشبو باقی رہتی ہے۔ ندہ صورت مشکل ہے ندہ چلت پھرت نہ آنکھوں کی جلد جلد حرکت نہ چہرے کی رنگتوں کا خوشنما نی کے ساتھ بد لانا نہ دہ تیر تیز شوق آمیز نکاہ میں غرض دومنہدم عمارتیں ہیں جن کے لٹٹے پھولے آثار اب تک باقی ہوں۔ اگلی جمل دہل خواب و خیال ہو گئی پہلے دیر تک ایک دوسرے کو عنور سے دیکھتے ہے نکاہوں میں شائیہ اشتیاق اب بھی باقی ہے۔ خورشید بیگم کی نکاہ میں اس طرح پڑیں جیسے کوئی کسی کو دم والی حسرت بھری نظر سے دیکھئے، خورشید مرزا کے دل پر نئی چوٹ لگی۔ اگلی بات چیز کا انداز مشکل یاد آیا۔ بڑے بڑے ناموں کے زبانوں پر لانے کی کلیف درپ

میں سے ایک نے گوارا نہ کی تھی اُنھوں نے خورشید مرزا کہا نہ اُنھوں نے خورشید بیگم، وہ دہی چھٹن رہے یہ سمجھن رہیں مگر یہ نام اب اس طرح منہ سے نکلتے ہیں جس طرح کندڑ ہن لڑا کے کے منہ سے بھولے ہوئے آموختہ کی نقطیں ختم ہم کے اٹک اٹک کے مگر چند ہی مرتبہ اٹکنے کے بعد کسی قدر رد اتنی آگئی مگر ضعف اور حجاب نے زیادہ روائی نہیں پیدا ہوئے دی، کسی نہ کسی طرح مہر سکوت ٹوٹی، پہلے خورشید بیگم ہی نے سبقت کی۔

خورشید بیگم۔ آخر تھا رہی بیوی دولڑ کیاں چھوڑ کے مر گئیں۔ اب تو وہ بھی جوان ہوں گی۔ خیر خدا لڑکیوں کو جیتا رکھے، کسی نہ کسی طرح تمہارا دل بہل ہی جاتا ہو گا۔ ہاں تو یہ کہو کہ بڑی کو زیادہ چاہتے ہو کہ چھوٹی بڑی کو۔

خورشید مرزا سداں سوالوں کے جواب کے لئے آمادہ تھے، اور ان کو اس استفسار سے دیکھی پتھی۔ اکوئی خصوصیت نہیں ہے، میرے نزدیک دونوں ایک ہیں۔ سچ یہ ہے کہ میں نہ لگھر میں زیادہ ٹھہرتا ہوں نہ کچھ زیادہ دخل دیتا ہوں خرچ فرے دیا۔ انماج منگوادیا۔ ما مائیں اصلیں موجود ہیں جو چاہیں کھائیں جو جی میں لئے پکھوائیں۔ گھنے کپڑے سب اپنے اپنے موقع سے اور ضرورت کے موافق موجود ہیں۔ میں بھی دو لوں وقت کھانا کھا لیتا ہوں۔ لڑکیاں اپنی راہ چلتی ہیں میں اپنی راہ پر جاتا ہوں۔

خورشید بیگم۔ مہری سے معلوم ہوا کہ اب ایک ساتھ دستِ خوان پر تھے لڑکیوں کے ساتھ ہی کھانا کھاتے ہو۔ یہ اچھا کرتے ہو بیجا رہی بے ماں کی بچیاں کچھ تو ڈھارس ہو۔

خورشید مرزا۔ آجاتفاق سے گھر ہی میں کھانا کھایا تھا۔ نہیں تو میں اکثر آکیلا کھاتا ہوں۔ کبھی کبھی ساتھ کھا لیتا ہوں۔

خورشید بیگم۔ اچھا تو کسی وقت اُن کو بُلا کے پاس بٹھاتے ہو، گلے لگاتے

ہو، پیار کرتے ہو۔

خورشید مرزا۔ - کسی قدر روکھے ہو کے، نہیں! یہ مجھہ کو کچھ نہیں آتا۔
بس یہ خیال کر لیا کہ ننگی بھوکی نہ رہیں، اور زیادہ منہ نہیں رکھتا۔

خورشید بیگم۔ تو یہ اکل کھڑا پن تو کچھہ اچھا نہیں ہے۔ اگر تم نے منہ نہ لگایا تو
کون منہ لگائے گا۔ خورشید بیگم نے فرائیوری بدلت کے، ناظرین کو آگے چل کے معلوم
ہو گا کہ خورشید بیگم لڑکیوں کے ساتھ طرزِ سلوک کو زیادہ کیوں دریافت کرتی تھیں۔

خورشید مرزا۔ ہاں ہاں خفافہ ہو یہ بات نہیں ہے کہ مجھہ کو لڑکیوں ساختا
نہ ہوا بنتہ کسی قدر میں بھی آزاد ہوں اور وہ بھی، میں اُن کے کھیل کو دیں دخل نہیں
دیتا نہ اپنے کاموں میں اُن کو دخل دیتے دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بجائے خود
خوش خرم ہیں۔ میں لے اول ہی سے ایسا اخلاص نہیں رکھا کہ اگر کبھی اس میں کمی ہو
تو رنجش پیدا ہو۔

خورشید بیگم۔ کہو تمہاری خاطر سے کہہ دوں کہ چلو اچھا ہے، میرے نزدیک
نہ تو زیادہ مہربانی چاہئے نہ ایسی بے پرواہی۔

خورشید مرزا۔ ہاں کچھہ ایسا ہی ہے۔ کہا تو کہ وہ بھی خوش ہیں، میں بھی خوش
ہوں۔

خورشید بیگم۔ تم کہتے ہو کہ میں خوش ہوں مگر مجھ کو نہ تمہارے چہرے سے
خوبی معلوم ہوئی ہے نہ بات چیت سے، کچھہ اکھڑی اکھڑی اکھل کھڑی سی طبیعت ہوئی
ہے (پھر کچھلی سوانح عمری خصوصاً لڑکیں کی خصوصیتوں کا خیال کر کے ایک آہ سرد
بھر کے) زندگیاں خراب کیں میں تم سے خفافی نہیں ہوں اپنا سماں حال جانتی ہوں جیسی
شادی ہوئی دلیسی نہ ہوئی۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ میری شادی کیوں ہوئی تھی کارندو
نے منہ بھرائی پل کے پنسا دیا تھا۔ میرا منہ بن تھا کرنی کیا۔ اماں جان لئے داؤں کی روح

نہ شرمندہ ہو، اپنی صند میں مٹایا۔ سچ یہ ہے کہ وہ بھی دھوکا کھا گئیں۔ ایسے ہی ٹھاٹھ دکھائے گئے تھے، خیرو گیا اچھا کیا کوئی یہ نہیں چاہئے گا کہ ہماری اولاد تباہ ہو، اپنے نزدیک اماں جان لئے بڑی دانانی کی بھی مگر چوک گئیں، چار پاؤں کا گھوڑا چوک جاتا آدمی کے تو دُدھی پاؤں ہوتے ہیں۔

خورشید مرزا۔ اب ان اگلے قصتوں کو عالئے دو۔ ان تذکروں کے چھپر لئے سوائے رنج کے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

خورشید بیگم۔ انسان ہے کبھی خیال آہی جاتا ہے۔ مگر میری زندگی کا آمر تو میری بھی ہے۔ اور تمھارا بھی سوا ان دو لکھ کیوں کے خدا ان کو رکھے رہتی دنیا تک اور کون ہے۔ لب اپنیں سے دل بیلاو۔ ہم کو تو اس کی بھی اُمید نہیں جے دن کی ہوا کھاتے ہیں کھاتے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو بھرتئے پھربات کا رُخ بدلتے ہیں میں نے سنا تھا تم دوسرا نکاح کرنے والے ہو۔ چلو اچھا تو ہے گھر بس جائے گا براہی کیا ہے۔ یہ فقرہ طعن کے لمحہ میں کہا تھا، یہ سب باتیں خورشید بیگم جنم صلحت سے کہہ رہی تھیں وہ ناظرین کو ابھی معلوم ہو جائیں گی۔ گویا خورشید مرزا کے دل کا بھی دینا چاہتی تھیں۔

خورشید مرزا۔ عورتوں کو سواتا دی بیاہ کے تذکروں کے اور کچھی نہیں آتا۔ تم یہ نہیں خیال کرتیں کہ ایک مرتبہ شادی ہوئی تو کیا دل خوش ہوا، اور اب پھر نکاح ہو گا تو کیا ہو گا۔ جب کسی کام کی ابتدا خراب ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی انتہا کا درست ہونا و شوار ہے۔ اب شادی کر لئے کیا کروں گا۔ یہ سچ ہے کہ میں لڑکیوں سے ذرا الگ الگ رہتا ہوں مگر ان کی تباہی بھی منظور نہیں ہے۔

خورشید بیگم۔ (چہرا بشاش ہو گیا) ہاں میں تو کہتی تھی تم اور اپنی اولاد کا دل دکھاؤ۔ تم کو غیروں کی ناخوشنی منظور نہیں ہوئی تو بھلا اپنی اولاد کی رنجش کیوں کر

کیوں کو دیکھی جائے گی۔ اب جو کچھہ دنیا میں زندگی کا ہزار ہے انھیں اولادوں سے ہے۔ خدا رکھ تھا ری دو ہیں۔ میری تو ایک ہی اندر کی لامبی ہے مگر الہی اختری رہتی دنیا تک رہے۔ سن تو کچھہ بھی نہیں ابھی کھلیئے کھانے کے دن ہیں مگر اتنے سے سن میں جو میری دیکھ بحال کی ہے اور کیا کرتی ہے۔ حکیم، نسخہ، دوا، ٹھنڈائی، پرہیزی کھانا سب اُسی کے ہاتھ ہے، میں تو کہتی ہوں اگر میری بچھی نہ ہوئی تو میں کب کی مردگی ہوئی اُس نے کوئی بات اٹھا نہیں رکھتی۔ لیکن مرض ہی لا علاج ہو تو کوئی کیا کرے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ میری زندگی کے اب بہت ہی کم دن باقی ہیں۔ جے دن اور دنیا کی ہوا کھانی ہے کھانی ہوں۔

خورشید مرزا۔ خدا تھیں اپنی لڑکی کے سر پر سلامت رکھے۔ ابھی تو ایسا حال نہیں ہے کہ ما یوسی ہو جائے۔ یہ باقی مرض مریض کی شفی کے لئے کہنا پڑتی ہیں مگر حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے۔ خورشید مرزا ایک نظر دیکھنے کے بعد ہی دل ہی دل میں سمجھہ رہے تھے جو خورشید بیکم زبان سے کہہ رہی تھیں، دق دوسرے درجہ سے بھی ترقی کر چکی تھی۔ چیت کا ہمینہ تھا بس اس اڑاہ ساون تک حد ہے۔ دوسری تین ہمینہ اس مریضہ کی زندگی کے اور باقی ہیں۔ اپنی رائے کی تعدادیں خورشید مرزا کی زبان سے تو سنتیں۔ کون کس کو کہتا ہے کہ ہاں پچھتے ہو تم چند روزہ ہمان ہو مگر بیکھا ہوں سے گفتگو کرے لیجے سے پایا جاتا تھا کہ خورشید مرزا کو بھی میری زندگی سے یاس ہے۔

خورشید بیکم۔ اچھا مرزا جینا یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے یہ کون چاہئے گا اور سبے زیادہ تم کب یہ چاہو گے کہ میں کی مرثی آج ہی مرجاوں، مگر ہمارا نہان کو عقل سے کام لینا چاہئے۔ میں نے جس مطلب کے واسطے تم کو بُلا یا ہے اب دہ کہنا چاہئی ہوں ذرا خوب کان دھر کے سفر اور جو کچھہ میں کہوں اُس کو سُن لو۔

خورشید مرزا - اس لمبی چورٹی نہیں کی کیا صردرت ہے یعنی کب تھاری بات نہیں سُنی، کب تھارے حکم کی تعمیل نہیں کی کس دن تھاری صدیں نہیں اٹھائیں درایا وکرو -

خورشید بیگم - چھرہ پر ذرا ساخون دوڑ آیا مگر صرف ایک لمحہ کے لئے پھر ایک آہ سرد بھر کے، ہاں ہاں یہ سب بجا درست پے شک تم لے میری ناز برداریاں کی ہیں مگر اب جو کچھہ میں کہوں گی وہ میری آخری صندھے ہے۔ بلکہ وصیت کہو تو ٹھیک ہے - خورشید مرزا - مجھے کوئہ لوانا ہی منظور ہے تو خیر و نہ ایسی باتیں مجھے سے نہ کہو میں تھاری مشکل سے مشکل اور سخت سے سخت فرمائش کے پورا کرنے کے لئے اب بھی حاضر ہوں مگر تامقدور -

خورشید بیگم - سُنوا! بات یہ ہے کہ میری شادی جس طرح ہوئی وہ قم خوب جانتے ہو۔ نہ الفت نہ محبت محض روپیہ کالا پچ۔ ایک شخص نے چاہا کہ سوئے کی چڑیا ہاتھ آجائے۔ سوئے کی چڑیا جاں میں پھنس گئی۔ پنجمرے میں ڈال دی گئی۔ پنجراں ہے کا ہو یا سوئے کا۔ مطلب قید سے ہے۔ ایسی شادی سے کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ یہ سچ ہو کہ اب پنجمرے کی کھڑکی کھل گئی۔ مگر اب طاقت پر واز کہاں۔ ایسا قید سے چھوٹنا اسی سے بدتر ہے۔ خیر۔ آدمی پر جیسی بنتی ہے دیسی اٹھا لیتا ہے اگرچہ کبھی کبھی جلن کے لائے پڑ جاتے ہیں اور میرے لئے بھی سامان ہوا، خیر شکر ہے مگر اپنی اولاد کے لئے انسان ہر طرح کی بہتری چاہتا ہے۔ آخرتی ماں باپ دونوں کی جائیداد ملا کے کچھہ کم ایک کمرہ کی مالک ہے۔ مجھے اندر یہ شہت ہے کہ اس کا بھی وہی دہارا نہ ہو جو میرا ہوا بیگم شکار لوگ اگر اس کا پتہ پا جائیں گے زندگی دشوار کر دیں گے۔ بیٹھنا مشکل ہو گا۔ خدا جانے میری بچی کی آبرد پر بن جائے جان پر بن جائے، سیکھڑوں جاں پھندے تیار ہوں گے ہر طرح سے پھانسے کی کوشش کی جائے گی میرا یہاں

ہے۔ چند ہی روزوں کے بعد یہ بن ماں باپ کی بھی ہو گی، ایک سو نے کی چڑیا اور سکرڈلی چڑیا مار کسی نہ کسی جال میں پھنس جائے گی۔ پھر دشمنوں کے ذبح کرنے کی کوشش ہو گی۔ زندگی دو بھر ہو جائے گی، غرض ہر طرح جان بچنا مشکل ہے یہ ہونا ہے اور ضرور ہونا ہے۔ صرف ایک ہی اس معصوم بھی کی نجات کا سہارا انظر آتا ہے اور وہ تمہاری ذات پر مخصر ہے۔ یہ میں خوب جانتی ہوں کہ اگر تم عامی بھرو گے تو میری بھی اس عناب سے چھوٹ جائے گی۔ اس تہلکہ سے بچ جائے گی۔ لوأب اقرار کر دے میرے ہی سر کی قسم کھاؤ کہ جو میں کھوں گی دے ہی کر دے گے۔

خود شید مرزا - آخر میں سلوں تو کیا چاہتی ہو۔ کس بات پر قسم کھاؤں۔
خود شید بیگم - چاہتی ہوں کہ تم اس بھی کے سر پر ہاتھ رکھو اس کے دلی بنو مگر یہ حال کسی پر نہ ہلے۔ میں دو تین دن سے زیادہ لکھنؤ میں نہ ہھر دیں گی۔ اُس کے بعد ڈاکڑا کہتے ہیں کہ پہاڑ پر چلی جاوے۔ میں منصوری پہاڑ پر چلی جاؤں گی، جب تک میں زندہ ہوں بھی میرے دم قدم کے ساتھ ہے۔ جب میں مر جاؤں تو بھی کوئی نہ گھر میں لیجانا جہاں وہ دولڑکیاں ہیں تیسری یہ ہے۔ مگر یہ ظاہر نہ ہو لے دینا کہ یہ اتنی بڑی جائیداد کی مالک ہے۔ اگر کوئی شرفی ہلے مالن جس پر تم کو پورا بھروسہ ہو مغض ثرا نت خانہ اپنے کے لحاظ سے لڑکی مانگے خوب کی پورا ہی کر کے چُب چھاتے نکاح کر دینا۔ جب قانونی بالغ کا زمانہ آجائے تو جائیداد اُس کے پیرو دکر دینا مگر زندگی بھر ساتھ نہ چھوڑ نا، جائیداد والی عورتیں بڑی مشکلوں میں پڑ جاتی ہیں۔ شادی ہونے کے بعد بھی اگر شوہر ایماندار ہوا تو خیر درنہ طرح طرح کی ایندیا میں پہنچتی ہیں۔ بلس یہی میری خواہش ہے اور آخمری خواہش ہے۔ ہاں جب تک وہ وقت نہ آئے تمہاری لڑکیوں تک کو معلوم نہ ہو کہ اختری صاحب جائیداد ہے۔ اس میں بڑی بڑی خرابیاں

جن کو میں خوب سمجھتی ہوں، گویا آنکھیں سے دیکھہ رہی ہوں۔ اور جب یہ بھی کھل بھی چائے اور شادی ہو جائے اُس وقت بھی تمہاری حمایت کی ضرورت نہ ہے گی۔ تم خوب جانتے ہو۔

خورشید مرزا۔ اس رازداری میں یہ خرابی ہے کہ اس معصوم پنجی کو لوگ، میری نوکریں چاکریں خود میری لڑکیاں ذلت کنیگاہ سے دیکھیں گی۔ اس سے لڑکی کو بھی تکلیفیں پہنچیں گی۔ مجہہ سے بھی اُس کے رتبہ کے موافق کسی طرح اُس کی پردہ شہنشہ سکے گی۔

خورشید بکم۔ ہاں میں خوب سمجھتی ہوں لوگ کہیں گے، نہیں معلوم کس کی لڑکی تمہاری روٹیوں پر پڑھی، خیرات کے نکڑے توڑنی ہے۔ خیر باشد یوں ہی ہی اس میں کسی کام کیا اجارہ ہے۔ تمہاری نیک نظر اور مہربانی کافی ہے دنیا جو چاہی خیال کرے بلا سے۔ تم آپنے اور آپنے لگھر کے حاکم ہو۔ لوگ یہ سمجھہ لیں گے کہ دُور دُرانہ کی قرابت کے لحاظ سے یا مخفی خدا ترسی سے کسی غریب کی لڑکی لے کے پال لی ہے۔ پھر اس میں کیا برآئی ہے۔ ہاں ایک تکلیف اور ہو گی، دو تین دن کے لئے کلکستہ جانام ہو گا۔ ولایت کی درخواست کے لئے مگریہ کوئی دشوار بات نہیں ہے۔ کلکستہ میں اٹھنی بار سڑ مردمدہ کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لیں گے۔ صرف روپیہ کا خرچ ہے وہ خدا کے فضل سے موجود ہے۔ تم صرف درخواست پر مستخط کر کے چلے آنا۔ ہاں سب کام حسب دلخواہ ہو جائے گا۔ میرا وصیت نامہ مکمل ہے اے لو، لکس منگا یا گیا وصیت نامہ رجسٹری شدہ، خورشید مرزا کے نام کا، مع فہرست جائیداد ایک پوری سلسلہ لکس منگا یا گیا اور خورشید مرزا کی سپردگی میں پہنچ گئی۔ قول قسم سر کی قسم۔ عذر موزرات مشکلات کُل مرحلے طے ہو گئے۔ اب ایک نظر اُس بھی کو بھی دیکھ لوجس کے تم ولی بنو گے اور جو آج ہی سے تمہاری لے پانک سمجھی جائے گی۔

کر کیم مانا کو آواز دی گئی۔ وہ حاضر ہوئی، چھوٹی بیگم کو بُلا لاد۔ چھوٹی بیگم کو نیچوڑ پسند رہ بہ س کا سن بھولی بھالی صورت، نہ تکنت نہ غدر۔ سادہ سادہ بیاس ہلکا ہلکا زیور، گورنی بگت جیسی گلاب کی پتی۔ بوٹما ساقد۔ شریفانہ بناد۔ سیدھی مانگ۔

صورت سے پکاپن معلوم نہیں ہوتا مگر امیرانہ پن تمیزداری ظاہر ہے۔ نہایت ادب سے سامنے آ کھڑی ہوئی، مگر چہرہ اُداس اُداس۔ کیوں نہ ہو ماں کا حال پیش نظر ایسی نادان نہیں۔

خورشید بیگم۔ بیٹا یہی تمہارے ماہوں جان ہیں جن کا اکثر سی تذکرہ کیا کرتی تھی۔

لڑکی نے نہایت ادب سے جھک کے سلام کی۔ خورشید مرزا نے گھلے سے لگایا۔ پھیکے سے اُس کہ سی پہ جو اماں جان اور ماہوں جان کے درمیان میں پہلے سے بچھی ہوئی تھی ماں کا اشارہ پا کے بیٹھ گئی۔ صالح حبیقی نے جہاں کہیں صورت اور سیرت کو کسی آدمی زاد میں خواہ مرد ہو خواہ عورت اکی جگہ جمع کر کے قدرت نافی کی ہے۔ وہ فطرت کے بہترین نظاروں سے ہے، یہ لڑکی بہمہ صفت موصوف تھی۔ پیاری پیاری صورت کے ساتھ نیک دلی، نیک نیتی، پاکیزہ خیالات، تمیزداری سلیقہ شعاراتی، رحمد لی، ترس خدا، معصوم صفتیں، چاپ عورت کا قدرتی جو ہر ہے مگر مشرط یہ ہے کہ جھینپ کے ساتھ نہ ہو، جھینپ میں دل کی چوری پکڑ لی جائی ہے یہ حد سے زیادہ مژہم، بہنکی موی نکاہیں کچھ اچھے خیالات کے آثار نہیں ہیں بن ہی لو جوان عورت میں اکثر پیجھت سے لذت عشق کی تر غیب پیدا ہو جائی ہے۔ یہ بلا چھوٹے سے بن میں خیالات کو ناپاک کر دیتی تھی۔ جہاں یہ داع لگا، پھر زندگی پھر نہیں چھوٹتا۔ ایسی نکاہیں اُن نظاروں کو ڈھونڈا ہیتی رہتی ہیں جس کی طرف دل کی شودیدگی جذب کرنی ہے۔ پھر یہ لوبت پہنچتی ہے کہ کسی نوجوان کو دیکھا انگاہ بازی

کی مشق ہوئے لگی، کسی کو جھانگ کے دیکھ دیا کسی کوتاک کے دیکھ دیا۔ یعنی آنکھ لڑائی۔ کسی کو صورت دکھا کے پھر شrama کے منہ چھپا لینا۔ کسی کی طرف بے جواب اشارہ کر دیا۔ کسی کو انگوٹھا دکھایا، کسی کو منہ چڑھایا۔ مشق ستم کا اندازی بھی تاریخ نے والی نظر دیں سے نہیں بچتا۔ خود شید مرزا نے دنیا دیکھی تھی پچھے زمیں سے عشق کی چوٹ کھائی تھی۔ مایوسانہ زندگی گھبرا گھرا کے دیکھی کے سامان پیدا کرنی تھی۔ سینہ کی آنکھ بُجھانے کے لئے عشق کا دارغ مٹانے کے لئے علاج بالمثل کے قائدہ سے ایک زخم کے اچھا کرنے کے لئے دوسرے زخموں کی اور ایک دارغ مٹانے کے لئے دوسرے داغوں کی ضرورت پڑنی رہی تھی۔ خود شید مرزا نے دیکھیوں کا سامان تلاش کرنے میں کوئی بھی نہیں کی تھی۔ اگرچہ کوئی تدبیر بن نہ پڑی کوئی علاج کا رگرہ نہ ہوا۔ مگر اچھے خاصے تجربہ کاربن گئے تھے۔ لکھنؤ کے امیرزادوں کی صحبتیں اٹھائے ہوئے تھے۔ ایک زنگاہ سے عورت کی پوری زندگی کا گذشتہ اور آئندہ اُن کے سامنے آ جاتا تھا، مگر اس معصوم صفت امیرزادی کو دیکھ کر یہ بہت بھی خوش ہوئے۔ ایک بھی نظر میں حلاحت بھی منظور کر لی اور حمایت بھی لے پاک بنالیا۔ اس قدر جلد ایک خاص ارادے کے پیدا ہوئے اور فوراً مضبوط ہو چکا۔ پر شاید کوئی اعتراض کرے تو اس کو اس داقعہ کے سامان اور اس پر ایک نظر دالنا کافی نہ ہوگا۔ اولًا خود شید بیگم سے دلی تعلق اگرچہ اس معاملہ میں سخت ناکامی ہوئی بھی بڑا چرہ کا کھایا تھا۔ جس نے اُن کو تمام زندگی کو تباہ کیا۔ لیکن اس میں خود شید بیگم کا کوئی قصور نہ تھا۔ خود شید بیگم کی حالت و احتجاج رحم تھی، صندھی ماں نے جہاں جھونک دیا تھا وہ جگہ کسی طرح خود شید بیگم کی زندگی کو دیکھ بلنے کے لئے کافی نہ تھی اور سب سے زیادہ ملک کے دستور کے موافق شکایت کی مجال نہ تھی۔ خود شید بیگم کو وہ

تعلق بھلا دینا پڑا جو بھولنے والا نہ تھا۔ شادی ہونے کے بعد اگر کبھی خورشید مرزا کا نام زبان پر آتا سو عیب لگ جاتے۔ ناکردار گناہ کار ہو جاتی۔ چرچے ہونے لگتے۔ ”اوہ ہوئی۔ اہم نہ کہتے تھے خورشید مرزا سے بن بیا ہے پن میں آشامی ہتی۔“ ایک شریف عورت کے لئے اس سے بڑھ کے کیا کم بخستی ہو گئی کہ بن بیا ہے پن کی پاک زندگی پر ناجائز تعلق کا جھوٹا الزام لگا دیا جائے، مگر دنیا وہ نالائق ہے کہ ایک بہودہ بات کا منہ سے بک دینا آسان سمجھا جاتا ہے اور اُس کے انجام کی مطلقاً پروانہیں کی جاتی ہے کہ اس کا دوسرا ہے پر کیا اثر پڑے گا مگر خورشید بیگم اپنی احتیاط کی زندگی پر مخز کرنی تھیں کہ ان پر کسی کو الزام لگانے کا موقع نہیں ملا۔ کلکتہ کی زندگی میں انہوں نے اپنے لکھنؤ کے تعلقات کا کبھی ذکر ہی نہیں کیا جو کسی کو کچھہ ہمنے کا موقع ملتا مگر یہ ہو کر ان کو خورشید مرزا کا خیال نہ رہا ہو یہ ناممکن تھا۔ اس بچپن کی محبت کو دہ دل میں چھپائے رہیں۔ دل میں آگ کو اس طرح دبا کے رکھا کہ دھواں تک نہ نکلنے دیا۔ خورشید مرزا کی ایک ایک بات انکو یاد رکھی ان کی صورت کی پوری تصویر ان کے دل میں رکھی، ان کی ایک ایک بات یاد رکھی، اور یہی حال خورشید مرزا کا تھا۔ یہ پاک محبت ایسی مستقل اور دریافتی کہ با وصفت دوری دونوں قریب تھے۔ ایک کو دوسرا ہے پر بھروسہ تھا یہی وجہ تھی کہ خورشید بیگم جب اپنی زندگی سے نامیں ہوئی انہوں نے اپنے کلیچوں کا ٹکڑا خورشید مرزا کی سر دگی میں دیا اور انہوں نے بقول کیا اور اس کو کلیچے سے لگایا۔ اب خورشید بیگم کو اپنی لڑکی کے لئے جو کچھہ کرنا تھا کہ جسیں اور کیا کریں، اب خورشید مرزا کا کام تھا کہ سر دگی کا پورا حق ادا کریں اور اخترتی کا کام تھا کہ وہ اس دُور دراز کی عزیز داری کو اور اس جدید رشتہ باپ بیٹوں کا تعلق بنالے، خورشید مرزا کے دل میں چلکرے اور پچھے تیسری لڑکی بلکہ ان سے

بھی کچھ بڑھ کے ہو جائے، ایسا ہی ہوا۔ خورشید مرزا کو واقعات پر نظر کے
اس بن ماں باپ کی بھی کی خاطرداری اور لاد سے زیادہ (گوکسی قدر ظاہرست
کی آمیزش ہو) کرنا ہی چاہئے تھی۔ اور آخرتی کو اپنے حُسن سلوک سے اس کا
معادضہ کرنا تھا۔ اس وجہ سے پالنے والے اور لے پاک کے تعلقات حصیقی باپ
بیٹیوں کے تعلقات سے بڑھ گئے، اور نہ بڑھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ آخرتی کی
معدوماتہ دل ربانی ایک خداداد جو ہر جو بیت کم لڑاکیوں کو نصیب ہوتا ہے، یعنی
پاکیزہ خیالات اور دل کی نیکی اور اس سبب کے ساتھ حُسن ظن وہ اپنی ماں کو اپنا
سچا خیر خواہ جانتی تھی اور یہ سمجھہ گئی تھی کہ جو کچھ ہوا ہے میری بہتری کے لئے ہے۔
واقعی خورشید مرزا نے بڑی ذمہ داری کا کام، بڑا بھاری بو بجھ اپنے سر پر اٹھایا
تھا۔ ظاہر میں تو بیٹھے بٹھائے کچھ کم ایک کروڑ کی جائیداد ہاتھ آگئی تھی۔ اگر کوئی بے ایمان
جعلیہ مٹکا رہوتا تو اس کو باپ کا سامال سمجھہ کے ہضم کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن خورشید
مرزا ایک مستقی خدا تریس پاک پے باک اگلے بانکین کی صفت پر ناز اس تیم کے مال سے
ڈرلنے والے قدیم رئیس زادے تھے جو اگلی جاہ و ثریت نہ تھی لگرنیت اور بہت
دیسی ہی تھی۔ رئیس جل گئی تھی مگر بل نہیں جلا تھا۔ اُن کا جی چاہتا تھا کہ تیم کا ایک
جتنہ بھی صدائے نہ ہو۔ ہاں وہ تنگی سے زندگی بسرز کرے مگر میں اس مال سے ایک
پیسہ کا سحق نہیں ہوں۔ آخرتی کی شکلیں پیش پا اُتادہ تھیں۔ جس گھر میں اسکو
رہتا ہو گا وہ بالکل نیا گھر ہے۔ وہاں کسی کو آخرتی کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے
لڑکیاں ان تعلقات سے بے خبر ہیں۔ آخرتی سے بےاتفاقی گوب ظاہر کیوں
نہ ہو۔ اس کو ایذا دینا ہے۔ جو خورشید مرزا کو کسی طرح گوازا نہیں ہو سکتا تھا، اتفاق
سے سینکڑوں دہم اور شک پیدا ہوں گے۔ لہر کیاں کیا کہیں گی، لذکر من چاکریں
کیا کہیں گی۔ اگر آخرتی کی مقدرت کا راز کھوں دیا جاتا تو کچھ مشکل نہ تھا۔ کسی امیر

کی لڑکی ہے جو خورشید مرزا کے سپردگی گئی ہے۔ ہر شخص خاطر کرتا ہر شخص آنکھوں پر بٹھاتا، مگر خورشید بیگم کی دھستت تھی کہ اس کا اظہار نہ ہو، ناظرن کو یاد رہے کہ یہ ذمہ داری خورشید مرزا نے بڑی مشکل سے اپنے سری تھی، وہ اس کی دشواریوں کو سمجھتے تھے اور دشواریاں پیش آئیں۔

اختری کی صورت بھی اچھی تھی، دل بھی نیک تھا۔ اُس کو آئندہ خورشید مرزا کے گھر پر اور ان کے قانونی ولی ہوئے کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ اُس نے بھی بشرط و جھدیں پ کو جو اکثر جہالت اور گناہ گارمی کی آمیزش سے مل کر پیدا ہونی تھے۔ پہلے ہی سے بالائے طاق رکھدیا تھا۔ گواختری خورشید مرزا کو ہمیشہ ماموں جان کہتی رہی لیکن اُس نے پہلے ہی دن سے خورشید مرزا کو اپنا باپ سمجھدیا تھا۔ وہ اپنی چاہتے والی ماں اور خورشید مرزا کے پاک تعلقات تھے بلے خبر نہ تھی۔ آماں جان خورشید مرزا جن کو اب ماموں جان کہتی ہوں۔ آماں جان کے عزیز اور سچے کے ساتھ کھلے ہوئے ہیں اور انہیں سے آماں جان کی شادی ٹھہری تھی۔

خورشید بیگم نے بھی اُسے پہلے ہی سے اس نازک رشتہ کی باریکیاں سمجھا رکھی تھیں۔ اختری دل میں کہتی تھی اگر آماں جان کی شادی ان سے ہوئی تو میری نہیں کی بٹی ہوئی۔ اچھا شادی نہیں ہوتی۔ میں علی جان کی بٹی ہوں میرے باپ نے میری ماں کی کبھی پرداہیں کی وہ دولت کو چاہتے تھے جب وہ اُن کو مل گئی تو وہ کلچھ تر اڑا لے لگے۔ مجھ پر بھی کچھ ایسی توجہ نہیں کی۔ میں فقط اتنا حابنتی ہوں کہ علی جان میرے باپ تھے مجھے میری ماں نے پالا پرورش کیا، پڑھایا، لکھایا غرض میں ہمیشہ سے بن باپ کی ہوں۔ باپ کی زندگی میں لوگ کہتے تھے کہ مجھ پر تیبی برستی ہے جس کا باپ دو دو مہینہ گھر میں نہ آئے اور آئے بھی تو مجھے آنکھ اٹھا کے نہ دیکھے نہ پاس ملائے نہ گلے لگائے بات تک نہ پوچھے، ارمان رہ گی کہ عید بقر عید تو بلا کے گلے لگائے تکبھی تو

پیار کرتے۔ دنیا کے باپوں کو دیکھا کیسا بیٹیوں کو چاہتے ہیں۔ یہ بماری تقدیر میں نہ تھا۔ ہم نے تو اپنے باپ کو جب گھر میں دیکھا مونہ تھوڑا تے تو بھری چڑھاتے آماں جان سے لڑتے ہی دیکھا۔ یا یہ سننا آج ہیرے کے جڑا اور بازوں پر دید و کل موتیوں کا ملا دیدو۔ باہر سننا ناپھ ہورہا ہے، رندیاں آئی ہیں، جھولے پڑے ہیں، پکوان تملے جا رہے ہیں۔ آماں جان یہ سب دیکھتی سہتی ہیں۔ مونہ سے اُف نہیں کہتیں، دل ہی دل میں تھکنی جاتی ہیں۔ آپ ہی آپ سُلگ رہی ہیں جبھی تو پرستق ہو گئی، آخر جان کے لالے پڑ گئے۔ آماں جان کی ساری دولت اور وہ اس طرح اُڑ رہی ہوادا اُن کی یہ گت ہوا فسوس آماں جان کی بھی کیا بُری تقدیر ہے۔

اختری کے یہ خیالات تھے جب وہ خورشید مرزا سے پہلے پہل ملنے کو آئی تھی اگرچہ وہ خورشید مرزا کو نہ جانتی تھی مگر آنا جانتی تھی کہ انھیں سے ملنے کے لئے آماں جان لکھنؤ میں آئی ہیں اور ان پر ایسا بھروسہ ہے کہ مجھے سُپر دکرمی ہیں۔

اختری اور خورشید مرزا کی پہلی لفتوں:- ماموں جان میرا آپ کے دیکھنے کو بہت جھی چاہتا تھا۔

خورشید مرزا - (مسکرے کے) بیانِ تم کیا جاؤ۔

اختری - واه! آماں جان آپ کا اکثر ذکر کیا کہ تی بھیں (پھر بات کا پہلو بدل کر) آماں جان بماری کی حالت میں اکثر آپ ہی کو یاد کرنی رہتی تھیں بہت بیمار ہو گئی تھیں اب توجہ سے لکھنؤ میں آئی ہیں بہت مزاج سنپھل گیا ہے۔ سنتی ہوں یہاں بڑے بڑے ناجی حکیم رہتے ہیں، آماں جان کو دکھا دیجئے۔ مجھے تو یقین ہے (یقین کیا وہم ہے) شاید یہاں کے علاج سے شفا ہو جائے۔ خدا کرے آماں جان اچھی ہو جائیں، مگر لمحہ سے ما یوسی ڈپک رہی تھی۔ کیونکہ ایسی بچپن تھی جو اس مہلک مرض کے انجم کو نہ سمجھی سکتی ہو۔

خورشید مرزا - حکیم صاحب کو تو میں دکھادوں گا - کل صبح انشاء اللہ تعالیٰ رحہ
لے کے آؤں گا، مگر مجھے کوڈاکرڑوں کی رائے سےاتفاق ہے۔ پہاڑ پر لے جانا بہت
ضروری ہے۔ سنتا ہوں کوئی درخت ہوتا ہے۔ شاید بد پچھہ کہتے ہیں۔ اُس کی ہوا
بہت مفید ہوئی تھے۔ ڈاکرٹ محقق اُس کی ہوا کو موثر علاج بتاتے ہیں۔

اختری - یہاں کے — بڑے ڈاکرٹ کی بھی رائے پنجے، اپنھا تو بڑے
ڈاکرٹ اور وہ حکیم صاحب جو کلکتہ بھی اکثر جاتے ہیں مجھے نام یاد نہیں، اماں جان کے
معارج تھے دلوں کو بلا لایتے۔

خورشید مرزا - وہ میرے عزیز ہیں اور بیگم (اس حالت میں خورشید مرزا نے
خورشید بیگم کو بیگم کہا ہے) کس دل سے اور کس ماہی سی کے ساتھ) سے بھی عزیزداری ہے حکیم
جعفر علی صاحب کو بھی شرکیں کر لے گا۔ جن حکیم صاحب کو تم نے کہا ہے اُن کا نام تو اس وقت
مجھے کو یاد نہیں مگر حکیم جعفر علی اُن کے شاگرد ہیں۔ خدا نے چاہا توبہ سب کل آجائیں
گے۔

اختری بیگم، یہ توجہ اپنی ماں کے علاج کی طرف دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔
ایک دھنڈی سی شکل امیہ کی سفید لکھ ابر کی طرح کو یا آنکھوں کے سامنے آئی مگر یہ
لکھ ابر ماہی کی تیز ہوا اُوں نے بہت ہی جلد اڑا کے نظروں سے غائب کر دیا، پھر وہی
اگلا خیال فائم ہدگاریا۔ کیسا، ہی علاج ہوا ماں جان کا بچنا مشکل ہے۔ کہیں ایسے بیمار
بھی اپنھے ہوتے ہیں۔

خورشید بیگم - (بیٹی سے مخاطب ہو کے) بیٹا تمہیں یاد نہیں جعفر علی میرا بھاںجہے
جو دو برس، ہدوں کے کلکتہ گیا تھا اور میں نے تم کو سامنے کیا تھا وہ میرا سمجھا بھاںجہے۔

بائب

طہیٰ معاونہ

اے طبیبو مے جینے کے کچھ آثار نہیں، نہ کرو نکر دوا

خورشید مرزا فیضو کی جو ملی سے سکھ کے این آبادگی طرف روانہ ہوئے۔ وہ ذمہ داری جو خورشید بگم کے سر کی قسم کھا کے انھوں نے اپنے سری لکھی اوس کی ہر تفصیل پر نظر لکھی۔ بار بار یہ خیال کہ وہ جس نے ۲۵ برس کے بعد اب یاد کیا کاش صحیح و سالم ہوئی یا ایسی عدالت ہوئی جس سے کسی طرح جانبی کی امید ہو سکتی تھی تو یہ آخری چھتہ حیات کا کس اطمینان کے ساتھ بسر ہوتا۔ بچپن کے ساتھ کی کھیلی ہوئی وہ جو مجھ پر دل و جان سے فدا تھی اور اب بھی فدا ہے، وہ جس کے عشق کی آگ ابھی تک میرے سینہ میں دبی ہوئی ہے، میری زوجہ ہوتیں میں شوہر ہوتا۔ کس مزے سے دن کلتا، افسوس اُسے دیکھا بھی تو کب دیکھا اور کس طرح سے دیکھا، ایک مرتبہ تو ظالم رقیب گود میں اٹھا کے لے گیا۔ اور میں دم بخود رہ گیا۔ اب ہوت کے پنجھ میں گرفتار ہے، آجیں دبو پچ ہوئے ہے۔ رقیب سے محلصی ہو گئی مگر ہوت کے پنجھ سے رہائی غیر ممکن ہے، ہم بہ صورت ناکام ہی رہتے۔ اب اس بھولی کھالی لڑکی کی پرداش اور اس پرداہ داری کے ساتھ لڑکیاں کیا کہیں گی۔ پہنچنے نہ بننے، نادرتی تو نہیں ہر دل عزیز نہ ہے کسی سے لڑنا جانتی ہی نہیں مگر جعفری رضا کا تنگ مرزاچ جس میں

رشک و حسد کا مادہ کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ اس میں شاک نہیں کہ وہ مجھ کو بہت چاہتی ہے مگر ایسی چاہت کس کام کی دوسرا کام سایہ نہیں دیکھ سکتی۔ نظر کے انتظام میں کوئی دخل دے سکے کیا مجال، یہ لڑکی جس کی پروردش کا بارہ دبیہ پیسے کے اعتبار سے مجھہ پر نہیں ہے مگر یہ خیال کہ مجھ پر اس کا بوجہ ہے یہ عجفری کو بے چین کرتا رہے گا۔ وہ اس کو بُری نگاہ سے، حقارت کی نگاہ سے، ذلت کی نظر سے دیکھے گی۔ مجھ ناگ کو اگر گذرے گا پھر منہ سے کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ اگر میں زیادہ دخل دؤگا عجب عجوب طرح کی بد گمانیاں پیدا ہوں گی۔ خدا جانتا ہے کہ میں اُس کو اپنی ہی اولاد کی جگہ سمجھوں گا۔ مگر عجفری کیا سمجھے گی۔ پھر اس کے بعد خیال آتا ہے تھا کہ جن کو شفار ہو جائے۔ وہ اپنی لڑکی کے سر پر سلامت رہے، دل بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ اچھی ہو جائے مگر عقل کہتی ہے دشوار مجال خبط۔

ایں خیال است و مجال است و جنوں

اچھا طبی معائنة تک کوئی رائے مستقل قائم نہیں ہو سکتی۔ سُنتا ہوں کہ یورپ کے بیسیوں نے اس مرض کا علاج پیدا کر لیا ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ ہوں سرجن بہت لائق معانج ہے روپیہ کے خرچ میں کمی نہ ہو گی۔ شاید امید کی کوئی صورت پیدا ہو۔ اسی خیال میں این آیاد تک پہنچ گئے، حسن التفاوٰ حکیم عجفر علی نے راستہ میں ٹوک کے تسلیم کی، ابھی مزاج پر سی ختم نہ ہوئی تھی کہ خورشید مرزا جیسے کوئی دفعہ سوتے سوتے چونکتا ہے۔

خورشید مرزا۔ (جیسے ابھی تک یہ خیال ہی نہ تھا کہ کس سے ملاقات ہوئی، ہے) اہاہ! عجفر علی، لے لو میں تو تمہارے پاس جا رہا تھا۔ اس وقت کوئی اور دعا مانگنا پوری ہو جاتی۔

عجفر علی میری خدا خدا نہ است آپ کو کیا ضرورت ہے جلدی ہکنے۔ یہ حکیموں